مختلف زبانوں میں بہت سی تصانیف موجود ہیں۔ زیر نظر کتاب بروڈہ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مقصود احمد کی تالیف ہے۔ یہ اصلاً ایک سمینار میں پیش کیا گیا مقالہ ہے، جسے بعد میں پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

کتاب میں حرفِ آغاز اور تمہید کے علاوہ آٹھ (۸) ابواب کے تحت تصوف کی تعلیمات پر اعتراضات کا تجزیہ، لفظ صوفی کے اشتقاق کا جائزہ، صوفی کی تعریف، تصوف کے مآخذ اور اس کی اساس، وصول الی اللہ کا مطلب اور اس کے حصول کا طریقہ، دیدار الٰہی سے متعلق بحث، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود، مرشد کامل کی ضرورت جیسے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

تمہید میں مصنف نے تصوف کی تعریف، اس کے بنیادی خدو خال اور معروف صوفیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر 'تصوف کی تعلیمات پراعتراضا عنوان سے بعض اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ 'تصوف نہ تو قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن وحدیث میں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ اس کا جواب مصنف نے یہ دیا ہے کہ اسلامی علوم میں بہت سی ایسی اصطلاحیں وارد ہوئی ہیں جو اسلام کے دور اول میں رائج نہیں تھیں، بلکہ کافی عرصے کے بعد وجود میں آئیں، لیکن انھیں بدعت قرار نہیں دیا گیا۔ یہی معاملہ تصوف کی اصطلاح کے ساتھ ہونا چاہیے۔ (ص ۱۹)

تصوف میں رہبانیت کا عنصر پایے جانے کے متعلق مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ مابعد زمانوں میں بعض متصوفین کے غیر محتاط رویے کے بنا پر کچھ ایسی نامناسب رسمیں ضرور در آئی ہیں اور کچھ ایسے ناروا عناصر داخل ہو گئے ہیں جو قابل اعتراض و مذمت ہیں''۔ (ص ۲۰)

ایک باب میں مصنف نے لفظ 'صوفی' کے اشتقاق سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ محققین نے مختلف الفاظ کو اس کا مشتق قرار دیا ہے، مثلاً صفا (پاکیزگی) صفۃ (چبوترہ) صف (قطار) صفوۃ (گدی کے بال) صوفانہ (ایک قسم کا پودا) صوفہ

(ایک قبیلہ کا نام) صوف (اون) وغیرہ۔ پھر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اصلاً لفظ 'صوف' ہی صوفی کا مشتق ہے (ص ۲۸) جب کہ مشہور صوفی امام قشیریؒ (۳۷۶۔ ۴۶۵ھ) نے اس اشتقاق کو صراحت سے غلط ٹھہرایا ہے۔ (ملاحظہ کیجیے: رسالۂ قشیریہ، مترجم: ڈاکٹر محمد پیر حسن، ادارۂ تحقیقات اسلامی لاہور، ۱۹۸۸ئ، ص ۵۰۹)

ایک جگہ فاضل مصنف نے 'دیدار الٰہی' سے بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے کھینچ تان کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں صوفیہ کو دیدار الٰہی ممکن ہے۔ (ص ۶۲) اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے مولانا انور شاہ کشمیری، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کے اقوال پیش کیے ہیں۔ لیکن اس کے مقابل جن صحیح احادیث اور صحابہ کرامؓ سے مروی مستند راویتوں سے ان کا رد ہوتا ہے، انھیں درج کرنے سے گریز کیا ہے۔

اس بحث کے ضمن میں مصنف نے اللہ کے رسول ﷺ کے عبادت الٰہی میں مستغرق ہونے کا ایک من گھڑت اور موضوع واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''ایک بار آپؐ اپنے حجرۂ مبارک میں عبادت الٰہی میں مستغرق تھے۔ اس اثنا میں حضرت عائشہؓ تشریف لائیں اور حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سرور کونینؐ نے اندر سے فرمایا: کون؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: بنت ابی بکرؓ وزوجۂ محمد سید المرسلینؐ نے فرمایا: کون ابوبکر؟ کون محمد؟ تب حضرت عائشہؓ کو احساس ہو گیا کہ اس وقت حضور ﷺ عالم استغراق ومحویت میں ہیں، چناچہ وہاں سے واپس چلی گئیں۔ (ص ۶۴) واقعہ بیان کر کے وہ لکھتے ہیں کہ'' اس واقعے کا ماخذ ذہن میں نہیں ہے، اس لیے حوالہ پیش کرنے سے قاصر ہوں''۔ حیرت ہے کہ فاضل مصنف نے، جو علم وتحقیق کی دنیا سے وابستہ ہیں، کیسے بلاحوالہ یہ بے سروپا واقعہ درج کرنے کی ہمت کی؟

تصوف میں عشق کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ عشق مرید کو اپنے پیر اور شیخ سے ہوتا ہے۔ عشق کی گرمی حاصل کرنے کے لیے صوفیہ نے مختلف قسم کے طریقے: سماع، جدال، راگ، موسیقی وغیرہ ایجاد کر لیے ہیں۔ مصنف نے بھی اپنے شیخ سے عشق

کی شدت کو بیان کرتے ہوئے ان کے ساتھ اپنی مجنونانہ کیفیت کے اتار چڑھاؤ کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا ہے۔ (ص ۶)

مصنف کتاب، پروفیسر مقصود احمد بڑودہ یونی ورسٹی میں شعبۂ فارسی، عربی و اردو کے صدر ہیں۔ اسلامی علوم کے مختلف موضوعات پر ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ امید تھی کہ اس موضوع پر وہ تحقیقی انداز میں لکھیں گے اور اسلامی تصوف کو غیر اسلامی تصوف سے الگ کر کے پیش کریں گے، لیکن افسوس، اس کتاب سے یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ (محمد اسعد فلاحی)

فکرِ اسلامی کا ارتقاء (ہندوستان کا خصوصی مطالعہ) ڈاکٹر ضیاء الدین ملک

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی۔ ملنے کا پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، صفحات: ۲۳۰، قیمت: درج نہیں۔

زیر نظر کتاب میں فکر اسلامی کے تسلسل اور ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی معتدل فکر کے حامل ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں علمیت اور ایجابیت کا رنگ ہوتا ہے۔ علمی حدود اور جادۂ اعتدال سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں اہل علم کی صف میں شامل کرتی ہے۔ ان کے مزاج و تحریر میں صالحیت و نافعیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کی اس نئی علمی کاوش میں بھی یہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ یہ کتاب اگر چہ مجموعۂ مقالات معلوم ہوتی ہے، مگر کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑی حد تک تصنیفی ترتیب، ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔

یہ کتاب پیش لفظ، تقریظ، سپاس گزاری، مقدمہ، چار ابواب، خلاصہ بحث، فکر اسلامی پر تحقیقات کا مختصر اشاریہ، نیز ماخذ و مصادر کی فہرست اور شخصیات کے اشاریہ پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی کی تقریظ شامل ہے۔ یہ تقریظ اس سوال پر تمام ہوتی ہے کہ ''اگر امتِ مسلمہ میں بحیثیت مجموعی اجتہاد کبھی نہیں رکا اور اگر اجتہاد بقول مصنف ہمیشہ معاشرتی ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ امت مسلمہ متواتر زوال کی جانب جا رہی ہے؟'' اس کتاب میں اس سوال کا جواب بجا طور پر موجود ہے۔ راقم کے

نزدیک اس سوال کا جواب بہت مختصر ہے اور وہ ہے رجوع اِلی الاسلام من جدید۔ بقول علامہ شبلی نعمانی ''مسلمانوں کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف پلٹیں اور اس طرح پلٹیں کہ قرون اولیٰ سے جاملیں''۔

فاضل مصنف نے اپنے مقدمہ میں اختصار اور وضاحت کے ساتھ فکر اسلامی کی تاریخ پر کلام کیا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ فکر اسلامی کی اصطلاح انیسویں صدی عیسوی میں خدا بے زار مغربی افکار کے ردعمل کے طور پر وضع کی گئی۔ انہوں نے فکر اسلامی اور علم کلام کے عنوان سے بھی جامع بحث کی ہے۔ اس ضمن میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر بھی کلام کیا ہے۔ یہاں ان سے اختلاف کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تشکیل جدید کی کاوشوں کو ہر زمانے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' راقم کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ تجدید کے علم برداروں کو ہمیشہ ان کی تجدیدی کوششوں کا نتیجہ مثبت ملا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوا ہے جب ان کاوشوں پر قرآن وسنت کا عکس، سیرت کا پرتو اور صلحاء امت کے اجتہادات کی روشنی غالب رہی ہے۔ محض تفردات اور ایسے تفردات جو تجدد پسندی کا مظہر ہونے کے ساتھ قرآن وسنت سے متصادم ہوئے، خواہ وہ کسی کے ہوں، کسی زمانہ میں پنپ نہ سکے۔ اس ضمن میں مصنف نے مولانا مجیب اللہ ندویؒ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس کا ایک جملہ یہ ہے: ''...ان حضرات (مفتی محمد عبدہ، سرسید، محمد اقبال) کی کوششیں یا تو علماء کی قدامت پرست ذہنیت کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکیں، یا لوگ ان کو سمجھ نہ سکے...'' اس عبارت نے راقم کو حیرت میں ڈال دیا، اس لیے کہ اس کی نسبت مولانا مجیب اللہ ندوی جیسے بڑے عالم دین کی طرف عجیب سی لگی۔ لیکن یہ حیرت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ راقم نے جب مولانا کے اصل مقالہ سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ جو اقتباس ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی طرف منسوب کیا ہے، مولانا نے اس میں اپنی فکر نہیں پیش کی ہے، بلکہ تنقید کی غرض سے اس سیمینار کے ذمہ داروں کی فکر نقل کی ہے جس میں انہیں مدعو کیا گیا تھا، پھر اپنے پورے مقالے میں اسی فکر پر تنقید کی ہے۔

مقدمہ میں آگے موضوع کتاب کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں لکھا گیا ہے کہ یہ موضوع نیا اور اچھوتا ہے۔ اس کی جگہ اگر یہ لکھا جاتا کہ اس نام سے

کتاب نئی ہے تو زیادہ موزوں تھا۔ مواد تو اس موضوع پر خوب میسر ہے، تاریخ اصلاح و تجدید اور مفکرین امت سے متعلق بے شمار تحریریں ہیں جن میں سے بہت سی کتابوں کا اشاریہ خود لائق مصنف نے کتاب کے آخر میں مرتب کر دیا ہے، تاہم اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنقیدی محاکمہ کو جگہ دی گئی ہے اور بیش تر نقد ایجابی و علمی ہے، البتہ اس سے انکار نہیں کہ کہیں انداز تجزیاتی ہے اور کہیں دفاعی، لیکن اچھوتے پن اور افادے سے خالی نہیں۔

باب اول میں فکر اسلامی کا تعارف پیش کیا گیا ہے، قرآن وسنت میں فکر اسلامی کی اساسیات پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، فکر اسلامی کے عناصر سے بحث بھی اس باب کی زینت ہے۔ عناصر کی تعیین میں مصنف کی فکری بصیرت ابھر کر سامنے آئی ہے اور پھر ان عناصر پر گفتگو بہت علمی اور بصیرت افروز انداز میں کی گئی ہے۔ انہوں نے سات عناصر شمار کیے ہیں: مقصدیت کی تلاش، جامعیت کا فروغ، اسلامی تہذیب کی حمایت ومحافظت، اجتہادی بصیرت، معروضیت وعلمیت، نافعیت اور عصری حسیت وغیرہ۔ مصنف کی نظر میں یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے فکر اسلامی کی آبیاری ہوتی ہے۔ کیا خوب ہوتا کہ فکر اسلامی کے عناصر میں آں محترم 'دعوتی مزاج' کو جگہ دیتے اور اس کی علمی تشریح کرتے۔ فکر اسلامی کے بانی حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی دعوت تھا۔ آپ کے تشکیل کردہ معاشرہ میں دعوتی مزاج کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ فکر اسلامی کے ارتقائی سفر میں اگر کہیں تعطل کا شبہہ ہوتا ہے تو اس کا سبب اس دور کے علماء اور اہل علم میں دعوتی مزاج کا فقدان ہی نظر آتا ہے۔ بہر حال الفاظ کا قالب تبدیل ہو سکتا ہے، مگر واقعی یہی وہ عناصر ہیں جن سے فکر اسلامی کا غلبہ وارتقاء ممکن ہے۔ اس میں بھی جامعیت کے فروغ سے صورت حال پر قابو پانا، جزوی اختلافات سے صرف نظر کرنا اور اسلام کی آفاقیت کو بحال کرنا خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اسی سے نسلِ نو کا اسلام پر اعتماد بحال کرنا ممکن ہے۔ جامعیت سیرت رسول اور اسوۂ حسنہ کا امتیازی وصف ہے۔ صحابہ کرام کی زندگیاں اسی صفت کے باعث قابل رشک نظر آتی ہیں۔

باب دوم میں فکر اسلامی کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے اولین